بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

معاہدۂ تاشقند پر پورے ملک میں شدید اضطراب کوئی ایسا اتفاقی حادثہ نہیں جسے محض بحث پر محمول کر کے نظر انداز کر دیا جائے۔ یہ اضطراب کسی شدید کرب کا پتہ دیتا ہے جسے ملک کے ہر خیر خواہ کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

آپ اس اضطراب کو چند سرپھروں کی شورش یا ہنگامہ پسندی پر محمول کر کے حقیقت سے اغماض نہیں برت سکتے۔ اس اضطراب کی لہر ملک کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک موجود ہے۔ اس کے نشان ہر چہرے پر نمایاں ہیں۔ سوائے ایک نہایت ہی مختصر سے طبقے کے، جو اقتدار کی غیر مشروط پرستش کو اپنے دین اور ایمان کا جزو سمجھتا ہے، یا جس کے نزدیک آقایانِ ولی نعمت کی خوشنودی دنیا کی ہر چیز پر مقدم ہے، باقی ساری قوم اس وقت سخت ذہنی اذیت میں مبتلا نظر آتی ہے۔

کوئی معقول آدمی مشکل ہی سے یہ باور کر سکتا ہے کہ وہی قوم جس نے ابھی چند روز پیشتر بھارتی جارحیت کے مقابلے میں حیرت انگیز اتحاد و اتفاق، جرأت و ہمت، اور عزم و تدبّر کا ثبوت دیا تھا اور جس کی معاملہ فہمی اور جذبۂ ایثار کا اپنے اور پرائے سب نے اعتراف کیا تھا، اسی کا دماغی توازن یکایک ۱۰ جنوری کو اعلانِ تاشقند سنتے ہی بگڑ گیا اور فکر و فہم کی صلاحیتوں سے وہ اچانک عاری ہو گئی۔ کسی فرد کا دماغ بھی آناً فاناً نہیں بگڑتا بلکہ بعض محسوس اور غیر محسوس عوامل عرصۂ دراز تک اُس پر اثر انداز ہو کر اُسے مضمحل کرتے ہیں۔ قوموں کے اندر صدمات کو برداشت کرنے کی قوت افراد کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہوتی ہے اور ان کا اجتماعی شعور معمولی حالات اور واقعات سے نہیں بگڑتا بلکہ فکر و احساس کا یہ گہرا سمندر غیر معمولی جھٹکوں اور زبردست [illegible] ہی سے متلاطم ہوتا ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں

جب ہم قوم کے موجودہ اضطراب کا جائزہ لیتے ہیں تو خود مضطرب ہو جاتے ہیں اور سوچنے لگتے ہیں کہ بار الہا! آخر یہ قوم ناشفتند کے فیصلے پر اچانک کیوں اتنی برہم ہو گئی ہے۔ ابھی کل کی تو بات ہے کہ اُس نے انتہائی پُر آشوب حالات میں غیر معمولی دانشمندی اور صبر کا مظاہرہ کیا تھا۔ جس قوم کا دماغی توازن بھارت کے اچانک حملے کے وقت بالکل صحیح رہا اس میں دفعتاً اتنا اختلال کیوں پیدا ہو گیا۔

یہ بات بھی قرین قیاس معلوم نہیں ہوتی کہ بیزاری کی یہ لہر محض چند مفاد پرستوں کا کھیل ہے پہلی بات تو یہ ہے کہ آج تک کسی ایسے "مفاد پرست" کی نشاندہی نہیں کی جاسکی ہے جو ملک و قوم کا دشمن ہو۔ اقتدار کے کسی فیصلے سے محض اختلاف تو کسی فرد یا گروہ کو مفاد پرست نہیں بنا دیتا بلکہ اقتدار کے ساتھ ہونا، اس سے اختلاف کرنے کی بہ نسبت مفاد پرستی کی زیادہ کھلی علامت ہے۔ پھر آخر حق، صداقت فہم، تدبر اور قومی مفاد کا احساس و شعور محض برسر اقتدار طبقہ کی اجارہ داری تو نہیں۔ دیانت اور اخلاق کی ان نعمتوں سے وہ لوگ محروم نہیں ہو جاتے جو ہر معاملہ میں اقتدار کی ہاں میں ہاں ملانے کے لیے تیار نہ ہوں۔ حالات پر غور کرنا، ان کے روشن اور تاریک پہلوؤں کا جائزہ لینا اور قوم و ملک کے لیے کسی چیز کے مفید یا نقصان دہ ہونے کے بارے میں رائے قائم کرنا جس طرح تخت و تاج کے "وارثوں" کا حق ہے اسی طرح اُن لوگوں کا بھی حق ہے جنہیں یہ مقام حاصل نہیں۔ اقتدار کوئی مقام خداوندی یا مقام نبوت نہیں کہ انسان کو بس اس کی پیروی اور بے چون و چرا اطاعت ہی کرنی چاہیے۔ جن لوگوں کو اقتدار ملتا ہے وہ بھی عام انسان ہی ہوتے ہیں اور ان سے بھی وہ ساری لغزشیں اور کوتاہیاں ہو سکتی ہیں اور فی الواقع ہوتی رہتی ہیں جن کی خطاکار اور کمزور انسانوں سے توقع کی جاسکتی ہے۔ اس بنا پر اقتدار کو محض اختلاف کی بنا پر برہم نہ ہونا چاہیے بلکہ عوام کے اضطراب کو دلائل سے دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسا عارفِ ربانی حیات بعد الموت جیسے اعتقادی مسئلے کے بارے میں اپنے پروردگار سے اطمینانِ قلب کے لیے شواہد مہیا کرنے کی درخواست کر سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنے ہی جیسے محدود عقل و فکر رکھنے والے انسانوں کے کسی اقدام

پر وضاحت کے طلبگار نہ ہوں۔ جس اقدام کی کوئی معقول توجیہ نہ کی جا سکتی ہو اس پر انسان کے دل میں فطری طور پر اضطراب پیدا ہوتا ہے اور یہ اضطراب لازمی طور پر کسی بدنیتی کا نتیجہ ہی نہیں ہوتا۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بڑھ کر حضور سرور کائنات پر کس شخص کو اعتماد ہو سکتا تھا اور اُن سے بڑھ کر کون اس حقیقت سے واقف تھا کہ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلّم کی زبانِ فیض ترجمان سے نکلی ہوئی کوئی بات کبھی غلط نہیں ہو سکتی۔ مگر اس کے باوجود صلح حُدَیبیہ کے موقع پر نبوت کے اس سچے فدائی اور جاں نثار خادم کے دل میں بھی بالکل فطری طور پر اضطراب پیدا ہُوا اور اُن کی طرح کے دوسرے مضطرب ذہنوں کی تسلی و تشفی کے لیے اللہ تعالیٰ نے سورۂ فتح نازل فرمائی۔ اس نفسیاتی کیفیت پر جو بالکل فطری تھی نہ تو اللہ برہم ہُوا اور نہ اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم نے کسی ناخوشی کا اظہار فرمایا بلکہ اسے انسانی فطرت کا خاصہ سمجھ کر اُن کی اس خلش کو دُور کرنے کی کوشش کی۔

خلفائے اربعہ رضی اللہ عنہم سے زیادہ اللہ کے حقوق کو کون پہچاننے والا ہو سکتا ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے ان جلیل القدر رفقاءِ کار سے بڑھ کر جن کی حضور نے خود تربیت فرمائی تھی، رعایا کے حقوق کا کون محافظ اور نگہبان ہو سکتا ہے۔ اُن کے عدل و انصاف، اُن کے احساسِ ذمّہ داری، اُن کی فرض شناسی، اُن کی دیانت اور امانت کے بارے میں کون شبہ کر سکتا ہے۔ مگر آثارِ صحابہ اور تاریخ میں ہمیں ایسی متعدد مثالیں ملتی ہیں کہ رعایا کے ذہن میں جب کبھی کسی معاملے کے متعلق معمولی اضطراب بھی پیدا ہُوا تو اُس نے اس کا برملا اظہار کیا اور خدا کے ان پاک بندوں نے عوام کی اس صاف گوئی پر انہیں جبر و تشدد کا نشانہ بنانے کے بجائے، ان کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے اپنے عہد کے بااختیار لوگوں کو صراطِ مستقیم پر قائم رہنے میں مدد دی ہے۔ اس اضطراب سے نہ تو وہ کبھی برہم ہوتے اور نہ اُن کے چہروں پر غیظ و غضب کے آثار نمایاں ہوتے۔ انہوں نے اس اضطراب کو عوام کی بیداری اور اُن کے احساس ذمہ داری کی شہادت سمجھا اور اس بات پر خدا کا شکر ادا کیا کہ اُن کی رعایا کے اندر ابھی ایسے لوگ موجود ہیں جن کے دلوں میں اللہ کا خوف ہر دوسرے

خوف پر غالب ہے اور اُس کی محبت تمام دوسرے علائق پر فوقیت رکھتی ہے۔ یہ حضرات ضمیر کی اس بیداری اور پھر اپنے ضمیر کے مطابق بات کہنے کی جرأت کو ایمان کی علامت سمجھتے تھے اس لیے وہ ہمیشہ اس بات کے لیے کوشاں رہتے کہ عوام کا ضمیر مُردہ نہ ہونے پائے، اور وہ اپنے دل کی بات بغیر کسی لاگ لپیٹ یا خوف کے زبان پر لا سکیں، کیونکہ ضمیر کی موت ایمان کی موت ہے اور ضمیر کی آواز کو دبانا کتمانِ حق ہے، جو قوم کے اخلاقی انحطاط کی کھلی اور واضح دلیل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خلافتِ راشدہ کے مقدس عہد میں اس بات کا پورا پورا اہتمام کیا گیا کہ لوگوں کے ضمیر مُردہ نہ ہوں اور اُن کے اندر منافقت سرایت کر سکے۔ وہ جب کبھی یہ محسوس کرتے کہ رعایا میں سے کوئی فرد یا گروہ حق کے اظہار میں متأمل ہے تو انہیں سخت تشویش ہوتی اور وہ اس صورتِ حال کی اصلاح کی فکر کرتے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں ملک کی زمام کار ہو اُن کی فکر و فہم کسی قوم کی قسمت کے فیصلے میں غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ عوام کو سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتوں سے بالکل محروم سمجھ لیا جائے، یا یہ فرض کر لیا جائے کہ غور و فکر کرنے کا حق صرف انہیں چند نفوس کو حاصل ہے جنہیں اتفاقاتِ زمانہ نے اقتدار کے تخت پر متمکن کر دیا ہے اور باقی قوم کا فرض صرف اسی قدر رہ ہے کہ جو کچھ یہ "خوش بخت" کہہ دیں یا کر دیں، اُسے منشاء فطرت سمجھ کر اُس پر بلا تأمل آمنّا و صدّقنا کہہ دیا کرے۔ قوم صرف چند افراد کے شعور کی بیداری سے زندہ نہیں رہ سکتی بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کا ہر فرد انفرادی اور اجتماعی معاملات کی پوری سوجھ بوجھ رکھتا ہو، وہ بھلائی اور بُرائی کے درمیان اچھی طرح تمیز کر سکے اور اپنے ذاتی اور ملّی نفع و نقصان کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگا سکے۔ چنانچہ دیکھیے کہ دنیا کی جن قوموں نے عوام کو حالات کے جانچنے اور پرکھنے کے بنیادی حق سے محروم رکھا وہ تھوڑی مدت کے بعد بانجھ ہو کر رہ گئیں اور اُن کے بطن سے مردانِ کار پیدا ہونے کے بجائے انتہائی بزدل اور کم کوش افراد پیدا ہونے لگے۔ معاملات پر غور کرنے اور انہیں سمجھنے کا ذوق چونکہ فطری ہے اس لیے جب بھی اس طرزِ عمل سے ہٹ کر کوئی دوسری راہ اختیار کی جائے گی اس سے انتہائی

مایوس کُن نتائج پیدا ہوں گے۔

پھر ہمارا ذہن یہ بھی تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا کہ "مفاد پرست" لیڈروں نے قوم کی عقل کو اپنی چرب زبانی اور جھوٹے پروپیگنڈے کے ذریعے آناً فاناً مفلوج کر دیا۔ اعلانِ تاشقند کی پہلی خبر جب ۱۰ جنوری کی شام کو ریڈیو سے سنی گئی اسی وقت پورے ملک کے عوام میں ایک ہیجان برپا ہو گیا اور دوسرے روز اخبارات سے تفصیلات معلوم ہوتے ہی ہر کوچہ و بازار میں اس پر لعنت ملامت ہونے لگی۔ سوال یہ ہے کہ آخر ان مفاد پرستوں کے پاس وہ کونسے ذرائع خبر رسانی تھے جن سے انہوں نے چشم زدن میں اپنے "گمراہ کن" خیالات سارے ملک میں پھیلا دیئے؟ ان کا حال تو یہ ہے کہ یہ اپنا کوئی بیان تک اخبارات میں نہیں چھپوا سکتے۔

دوسری طرف یہ بات بھی کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی کہ جو قوم انتخاب کے فیصلہ کن مرحلہ پر، جبکہ تحریر و تقریر کی تھوڑی سی آزادی تھی اور جذبات میں کسی قدر ہیجان بھی تھا، ان "مفاد پرستوں" کی ساری ترغیبات کو نظر انداز کر کے، برسرِ اقتدار طبقے کے بقول صحیح فیصلہ کرتی ہے، اسے آخر آج کیا ہو گیا ہے کہ وہ ایک صحیح اقدام کی پذیرائی نہیں کر سکتی۔ اگر آج جبکہ ملک میں ہنگامی حالات کا قانون نافذ ہونے کی وجہ سے کسی کو بات تک کرنے کی اجازت نہیں، یہ قوم ان مفاد پرستوں کے جھانسے میں آسکتی ہے، تو آخر یہ انتخاب کے موقع پر، جب کہ "قوم کے ان دشمنوں" کو اسے ورغلانے کی کھلی چھٹی حاصل تھی، یہ اُن کے ہتھکنڈوں سے کس طرح بچ کر نکل گئی؟ ان "مفاد پرستوں" کی پوزیشن اور برسرِ اقتدار طبقے کی پوزیشن میں جو عظیم فرق ہے ذرا اُسے نگاہ میں رکھیے۔ مفاد پرستوں کے خلاف مسلسل ایک لگے بندھے منصوبے کے تحت پراپیگنڈا کیا جا رہا ہے۔ انہیں ذلیل اور رسوا کرنے کے لیے جو تدابیر بھی ممکن ہو سکتی تھیں انہیں پوری طرح کام میں لایا گیا ہے اور اس غرض کو نشر و اشاعت کے سرکاری اور نیم سرکاری ادارے پوری دلجمعی سے سرانجام دے رہے ہیں۔ ان کے مقابلے میں ان "مفاد پرستوں" کی حالت یہ ہے کہ ان بیچاروں کے پاس اتنے بھی وسائل نہیں کہ وہ اپنی براءت ہی کر سکیں۔ اُن کی زبانوں پر پہرے ہیں، اُن پر خدا کی وسیع و عریض زمین اتنی

تنگ کر دی گئی ہے کہ وہ کسی مقام پر چند نفوس کو جمع کر کے اپنی مدافعت میں بھی کوئی بات نہیں کر سکتے۔ ان کے اخبارات اور رسائل پر طرح طرح کی پابندیاں عائد ہیں اور معاشی طور پر انہیں اتنا بدحال کر دیا گیا ہے کہ ان کے لیے زندہ رہنا بھی کسی طرح ممکن نہیں رہا۔ ان حالات میں انسانی عقل یہ کیونکر باور کر سکتی ہے کہ اس قسم کے "بدنام اور مفاد پرست" عناصر جنہیں اس ملک میں بالکل بے بس بنا کر رکھ دیا گیا ہے، لوگوں کے جذبات میں کوئی ہیجان پیدا کر سکتے ہیں۔

ان "مفاد پرستوں" کے متعلق اقتدار کا نقطۂ نظر خواہ کچھ ہو، وہ اپنی بے تدبیری کو چھپانے کے لیے خواہ انہیں کتنا ہی کوسے اور بدنام کرے، لیکن حالیہ جنگ میں ان لوگوں نے جس طرزِ عمل کا ثبوت دیا ہے، اُس سے ایک بات تو پُوری طرح کھل کر سامنے آگئی ہے کہ خواہ انہیں اپنے مفادات کتنے ہی عزیز ہوں مگر ملک و قوم کے مفادات انہیں عزیز تر ہیں اور وہ ان کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینے پر آمادہ ہو سکتے ہیں۔ ان ہنگامی حالات میں انہوں نے جس طرح تمام اختلافات، رنجشوں اور تلخیوں کو یکسر نظر انداز کر کے حکومت کے ساتھ ہر معاملے میں اور ہر مرحلہ پر پُورا پُورا تعاون کیا ہے، اسے دیکھ کر ایک انصاف پسند ذہن اس بات کو ہرگز قبول نہیں کر سکتا کہ مفادات کی محبت نے ان لوگوں کو اتنا اندھا کر دیا ہے کہ انہیں معاہدۂ تاشقند کے روشن اور تابناک پہلو نظر نہیں آتے، یا اقتدار کی بے پناہ مقبولیت نے اُن کے دل میں حسد کی ایسی آگ بھڑکا دی ہے کہ وہ فتح و کامرانی کی اس تاریخی دستاویز پر خوشی اور مسرت کا اظہار کرنے کے بجائے جل کر راکھ ہو رہے ہیں۔ اگر انہیں ہنگامی حالات میں ملک کے مفادات عزیز تھے تو اب بھی اتنے ہی عزیز ہیں۔ اُن کے فکر و نگاہ کے زاویے اتنی جلدی تو نہیں بدل گئے اور اُن کے مقدس احساسات و جذبات کی دنیا دفعتاً تو اُجڑ نہیں گئی۔ برسرِ اقتدار طبقے کے نزدیک ممکن ہے بھارتی جارحیت کا خطرہ ٹل گیا ہو، لیکن ان "مفاد پرستوں" کے جو خیالات مختلف پابندیوں کے باوجود چھن چھن کر ہمارے سامنے آئے ہیں انہیں دیکھ کر ہمیں یُوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ بھارت کو آج بھی اُسی طرح کا خطرہ سمجھتے ہیں جس طرح کہ ستمبر میں سمجھتے تھے۔ اُن کی نظر میں ابھی کشمیر کا مسئلہ بھی

جوں کا توں قائم ہے بلکہ خاص تشویشناک صورت اختیار کر چکا ہے، اور مسلمان قوم کے ہر غیرت مند اور صاحبِ حمیت انسان کو دعوتِ فکر و عمل دے رہا ہے۔ کشمیر کے مظلوموں کی دلدوز آہیں، وہاں کی عصمت مآب بیٹیوں کی چیخ پکار اور بچوں کی آہ وزاری ابھی اُن کے کانوں میں اُسی طرح گونج رہی ہے جس طرح کہ چھ ستمبر کو گونج رہی تھی۔ اگر یہ "مفاد پرست" جنگ کے دوران حکومت کے ساتھ ملی مفادات کے پیشِ نظر تعاون کر سکتے تھے تو آج بھی وہ حکومت کی کامیابی پر دل و جان سے خوش ہوتے اور بیزاری کا اظہار کرنے کے بجائے اللہ کا شکر بجا لاتے کہ اُس نے اُن کے رہنماؤں کو اتنی فراست اور جراٗت عطا کی ہے کہ انہوں نے میز پر بھی دشمن کو پچھاڑ دیا ہے۔ جن "مفاد پرستوں" نے ہر طرح کی گالیاں کھانے، اور قید و بند کی صعوبتیں جھیلنے کے باوجود ملکی مفاد کے معاملے میں حکومت کا پورا پورا ساتھ دیا ہے وہ آج بھی اس کے صحیح فیصلے کی پوری پوری قدردانی کرنے کے لیے تیار تھے۔ اُن کی ملی غیرت قوم اور ملک سے محبت اور کشمیر کے مظلوم بھائیوں سے ہمدردی اچانک تو ختم نہیں ہو گئی کہ وہ خواہ مخواہ عوام کے جذبات کو ایسے نازک وقت میں مشتعل کرنے کی حماقت کرتے جب خود اُن کے نزدیک ملک پر پہلے سے زیادہ مصیبت آن پڑی ہے۔

انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ اپنے بارے میں کوئی ناخوش گوار بات سننا پسند نہیں کرتا اور اس وجہ سے اُنہی لوگوں کی پذیرائی کرتا ہے جو اُسے اُس کی دل پسند باتیں سُنا کر اُس کے قلب و دماغ کے لیے سُرور کا انتظام کریں۔ انسان کے ہاتھ میں جتنی قوت و طاقت زیادہ آتی ہے اُس کی یہ خواہش بھی برابر بڑھتی چلی جاتی ہے کہ لوگ اُس کی زیادہ سے زیادہ مدح و ستائش کریں۔ اور جب ایک انسان یا گروہ اقتدار کے تخت پر فائز ہو جاتا ہے تو وہ کسی ایسی آواز کو سننا برداشت نہیں کرتا جو اُس کے ذہنی سُرور میں ذرہ برابر بھی کوئی فرق لا سکے۔ وہ اس سرور کو برقرار رکھنے بلکہ اس کیف و مستی کو دو آتشہ کرنے کے لیے اپنے گرد چُن چُن کر ایسے آدمی جمع کرتا ہے جو ہر وقت اُس کی اقبالمندی کے ترانے گاتے رہیں اور اُس کے ہر اقدام پر تعریف و توصیف کے ڈونگرے برسانے کو اپنی سب سے بڑی سعادت خیال

کرتے ہوں۔ نقد و جرح کی زبان کھولنے والے، یا اُس کے کسی فیصلے سے اختلاف کرنے والے اس کی نظر میں ہمیشہ معتوب و مغضوب رہتے ہیں۔ یہ طرزِ فکر یُوں تو ہر اقتدار کا خاصہ ہے، لیکن خاص طور پر ایسا اقتدار جس میں قوت و طاقت کا مرکز و محور ایک ہی شخصیت ہو، اس معاملے میں غیر معمولی حد تک حساس ہوتا ہے اور اسی لیے وہ اس روش کو برقرار رکھنے کا پورا پورا التزام کرتا ہے۔ اختلاف رائے اُس کے نزدیک سب سے زیادہ سنگین جُرم ہوتا ہے۔ وہ اپنی بستی میں چوروں اور ڈاکوؤں کو برداشت کر سکتا ہے، اُن کے جرائم بھی معاف کر سکتا ہے، لیکن اُن لوگوں کی بات کبھی نہیں سُن سکتا جن کا سوچنے کا انداز اُس سے مختلف ہو۔ اُس کا ہمیشہ ایک ہی غیر مشروط مطالبہ ہوتا ہے کہ یا تو زبان نہ کھولو، اور کھولتے ہو تو حمد و ثنا میں کھولو۔

ان حالات میں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ہماری مخلصانہ گذارشات اربابِ بست و کشاد کے کانوں تک پہنچ سکیں گی یا نہیں لیکن محض ادائے فرض کی خاطر، تاکہ ہم قیامت کے دن گونگے شیطان بن کر نہ اٹھائے جائیں، بعض باتوں کی طرف حکومت کی توجہ مبذول کراتے ہیں۔ حکومت کا جو طرزِ عمل ہمارے ساتھ رہا ہے اُسے دیکھ کر یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ ہماری ان معروضات کو درخورِ اعتنا بھی سمجھے گی۔ لیکن ہم ملکی بھلائی اور مفاد کی خاطر اُس سے اس بات کی درخواست ضرور کریں گے کہ معاہدۂ تاشقند کے بارے میں جو شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں انہیں سمجھنے کی کوشش کرے اور قوت و طاقت کے زور پر انہیں دبانے کے بجائے دلائل اور معقولیت کے ساتھ ان کو دُور کرنے کا انتظام کرے۔ اگر حکومت خود قوم کی ذہنی الجھنوں کو دُور کرنے کا کوئی التزام نہیں کرتی تو کوئی دوسرا شکوک و شبہات کے ان کانٹوں کو آخر کیسے چُن سکتا ہے۔ اور یہ حکومت کے لیے یا ملک اور قوم کے لیے کوئی پسندیدہ اور لائق ستائش بات نہیں ہے کہ عوام کے اضطراب کو، جس کے فی الواقع کچھ وجوہ ہیں، معقولیت کے ساتھ دُور کرنے کے بجائے انہیں بے حس اور اندھے بہرے تشدد کا نشانہ بنایا جائے۔ کوئی سامراجی حکومت، اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل کے لیے اس غیر انسانی طرزِ عمل کا مظاہرہ کرے تو اس کی وجہ سمجھ میں آسکتی ہے، لیکن اپنے بھائی ہی اگر ذرا ذرا سے اختلاف سے برہم ہو کر یہ طرزِ عمل اختیار کرنے لگیں، تو اس سے قوم کے اندر مایوسی کے سوا اور کیا چیز پرورش پا سکتی ہے جو پاکستان کے مستقبل کے لیے سمِ قاتل کی حیثیت رکھتی ہے۔

ان گزارشات کے بعد ہم صرف اُن الجھنوں کا ذکر کرتے ہیں جو معاہدۂ تاشقند کے معاملے میں پاکستان کے ہر فرد کے ذہن میں پیدا ہو رہی ہیں۔ ان الجھنوں کے بارے میں ہم پہلے ہی یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ انہیں جان بوجھ کر پیدا نہیں کیا گیا بلکہ معاہدے کے پس منظر اور اس کے الفاظ نے انہیں جنم دیا ہے۔ اور اس حقیقت کا اعتراف خود اُن حضرات کو بھی ہے جو اس معاہدۂ کو پاکستان کی فتح یا اس کے حق میں نیک فال سمجھتے ہیں۔ وہ بھی بار بار یہی کہتے ہیں کہ اس معاہدے کی عمیق گہرائیوں میں دیکھنے سے مسئلۂ کشمیر کا باعزت حل نظر آ سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے ہیں کہ خود انہیں اس بات کا احساس ہے کہ معاہدے کے بعد جو اعلان ہوا ہے اُس کے ظاہر و باطن میں بہت نمایاں فرق ہے۔ اب عوام تو کسی چیز کے صرف ظاہری پہلوؤں کو دیکھتے ہیں۔ باطن میں جھانکنا ان کے بس میں نہیں ہوتا۔ اس بنا پر اُن کے اندر مختلف شکوک و شبہات کا پیدا ہونا بالکل قدرتی چیز ہے۔

اس معاہدے کے متعلق سب سے پہلی الجھن خود اس کے پس منظر سے پیدا ہوتی ہے۔ امریکہ اور روس، جن کی کوششوں نے پاکستان اور بھارت کے سربراہوں کو ایک مقام پر جمع کیا، اُن کا جو طرز عمل ہمارے ساتھ رہا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ ہم نے امریکہ کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی کرنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ اس کی خوشنودی کے لیے ہم سیٹو اور سنٹو جیسے معاہدوں میں شریک ہوئے جن کی وجہ سے ایک طرف اشتراکی بلاک ہمارا مخالف ہو گیا، دوسری طرف خود ہمارے بھائی عرب ممالک ہم سے بگڑ گئے، اور اس پر مزید یہ کہ افریقہ و ایشیا کے بہت سے ملکوں میں ہمارے متعلق یہ بدگمانی پھیل گئی کہ ہم مغربی سامراج کے پٹھو بن گئے ہیں۔ مگر اس ملک نے ہمارے ساتھ کبھی اخلاص کا معاملہ نہیں کیا۔ وہ برابر اس تاک میں رہا کہ کسی طرح بھارت کی دوستی حاصل کرے اور اس مقصد کے لیے پاکستان کو قربان کر دینے میں اسے کوئی تامل نہ تھا۔ چنانچہ جونہی چین سے بھارت کی جنگ چھڑ گئی، اس نے پہلا موقع پاتے ہی بھارت کو بے پناہ فوجی اور مالی امداد دینی شروع کر دی اور ہم چیختے رہ گئے کہ یہ امداد عملاً چین کے خلاف نہیں بلکہ ہمارے خلاف ہے۔ بھارت پر چین کا حملہ محض ایک

بہانہ ہے، جو فوجی سامان آج اس کو چین سے لڑنے کے لیے دیا جا رہا ہے بالآخر وہ ہمارے خلاف استعمال ہوگا۔ ہمارے سارے احتجاج بے نتیجہ رہے اور ہمارا یہ حلیف بھارت کو مسلسل مضبوط کرنے کا سامان کرتا رہا۔ پھر جب ہمارے تمام اندیشے درست ثابت ہوئے اور بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا تو ہمارے اس حلیف نے اپنے اس عہد و پیمان کا ذرّہ برابر بھی پاس نہ کیا جو بیرونی حملہ کی صورت میں ہماری مدد کو آنے کے لیے اس نے کر رکھا تھا۔ اس نے صرف یہی نہیں کہ ہمیں خود اسلحہ دینے سے انکار کر دیا، بلکہ دوسروں کو بھی ہمارے ہاتھ اسلحہ فروخت کرنے سے روکا۔ جس ملک کے نزدیک دوستی میں وفاداری کا یہ معیار ہو اور جسے اپنے قول و قرار اور اپنے وعدوں کا اتنا پاس ہو اور جو پاکستان کو نظر انداز کر کے بھارت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اس قدر بیتاب رہتا ہو، اس سے یہ توقع کرنا کہ وہ اب کشمیر کے معاملہ میں انصاف کرانے کے لیے آگے بڑھ کر ہماری مدد کرے گا، ایک ایسی خوش فہمی ہے جس کی سرحدیں شاید ابلہ فریبی سے جا ملتی ہیں۔

ہمارے لیے روس کا طرزِ عمل بھی امریکہ کی طرح ہی افسوسناک رہا ہے۔ قوموں کی آزادی اور حریت کے اس دعویدار نے بھارت کے سامراجی عزائم کی طرح پشت پناہی کی اور بین الاقوامی انصاف کے اس نام نہاد علمبردار نے محض اس ضد میں کہ پاکستان سیٹو اور سینٹو کے معاہدوں میں شریک ہوگیا ہے، کشمیر پر بھارت کے غاصبانہ قبضہ کو نہ صرف کھلم کھلا جائز قرار دیا بلکہ ہر گام پر حق و انصاف کے سارے تقاضوں کو پس پشت ڈال کر ظالم کی پوری پوری حمایت کی۔ اس معاملے میں اس نے اتنی جانبداری کا ثبوت دیا کہ جب کبھی اقوامِ متحدہ کے سامنے کشمیر کے مظلوموں کا معاملہ پیش ہوا اور ان کی دادرسی کے لیے کوئی تحریک ہوئی تو انصاف کے اس مدعی اور ظلم کے اس دشمن نے اپنے خصوصی اختیارات استعمال کر کے اس معاملے کو مسترد کروا دیا۔

"آزمودہ را آزمودن جہل است" ایک مشہور حکیمانہ مقولہ ہے۔ بالفرض اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ دوسری اقدارِ حیات کی طرح اس محاورہ کی صحت میں بھی فرق آگیا ہے اور اب آزمائے ہوئے کو

آزمانا جہالت نہیں بلکہ دانشمندی ہے، پھر بھی صلح کے اس داعی پر اعتماد کرنے کے لیے آخر کچھ تو وقت درکار ہے، خصوصاً ایسے حالات میں جبکہ عین جنگ کے زمانہ میں اور اس کے بعد سلامتی کونسل میں ہم کو اس کے طرزِ عمل میں کوئی نمایاں تبدیلی نظر نہیں آئی۔ خدا کو کسی نے دیکھا نہیں بلکہ لوگ اُسے اس کی قدرت سے پہچانتے ہیں۔ بالکل اسی طرح کسی شخص کی نیت کا اندازہ اُس کی دلی کیفیت سے نہیں بلکہ اس کے طرزِ عمل سے لگایا جاسکتا ہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ جنگ کے زمانہ میں اور اس کے بعد بھی بھارت کو روس سے ہتھیار ملتے رہے ہیں؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ سلامتی کونسل میں روس کا جھکاؤ بھارت ہی کی طرف رہا اور اگر اس کے ویٹو کا دباؤ نہ ہوتا تو شاید سلامتی کونسل کی قراردادیں نسبتہً زیادہ ہماری موافقت میں ہوتیں۔

دنیا کی ان دو بڑی طاقتوں نے جس طرح اپنے مفادات کی خاطر جان بوجھ کر حق وانصاف کا خون کیا ہے اور مظلوم کے مقابلہ میں ظالم کی پاسداری کی ہے اس کے بعد ان پر اعتبار کرنے سے پہلے ہمیں ہزار مرتبہ سوچ لینا چاہیے۔

دوسری چیز جو ذہن میں خلش پیدا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اس معاہدے کی کوئی ایک شق بھی ایسی نہیں جو نئی ہو۔ اس طرح کی باتیں پہلے بھی کئی مرتبہ کی گئیں اور اُن سے کبھی کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہُوا۔ کیا پاکستان اور بھارت نے کشمیر کے مسئلے پر پہلے کبھی اپنے اپنے نقطۂ نظر کا اظہار نہیں کیا ؟ کیا ان دونوں ممالک کے نمائندوں کے درمیان پہلے اس موضوع پر کبھی گفتگو نہیں ہوئی ؟ کیا اس سے پہلے کبھی اس خیال کا اظہار نہیں کیا گیا کہ آپس کے اختلافات فوجی قوت کے بل پر حل کرنے کے بجائے افہام و تفہیم کے ذریعہ پُرامن طریقے سے حل کیے جائیں ؟ کیا اس سے پیشتر کبھی ان خوشنما جذبات کا اظہار نہیں کیا گیا کہ دونوں ممالک کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ معیشت و تجارت کے معاملے میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں اور آپس میں اچھے پڑوسی بن کر رہیں ؟ سوائے ایک شق کے کہ دونوں ممالک اپنی اپنی افواج پچیس فروری تک ان مورچوں تک واپس لے جائیں گے جن پر وہ ۵ اگست سے پہلے متعین تھیں، کوئی بات بھی ایسی نہیں جو پہلے کئی مرتبہ نہ دُہرائی جاچکی ہو۔

انسانیت کا وہ کونسا دشمن ہے جو امن وسلامتی کی اہمیت کو نہیں جانتا اور خواہ مخواہ انسانوں کا خون بہانے پر اصرار کرتا ہے۔ وہ کونسا ایسا بدنصیب انسان ہے جسے پڑوسی کے حقوق کا احساس نہیں یا جو باہمی تعاون کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ مگر عقل کی ان سب باتوں کو جانتے ہوئے بھی دونوں قومیں ایک دوسرے سے اُلجھ پڑیں۔ کیا دونوں ممالک کے انسانوں کی انسانیت مردہ ہو چکی تھی کہ آدمیت کے ان بنیادی حقوق کا احساس تک نہ رہا تھا اور اب اس احساس کو امریکہ اور روس نے زندہ کیا ہے؟ ان سب مقدس احساسات کو جاننے کے باوجود اگر دونوں ممالک کے درمیان منافرت تھی جو بالآخر مسلح تصادم پر منتج ہوئی تو اس کی بنیادی وجہ کشمیر پر بھارت کا غاصبانہ قبضہ ہی تھی۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا اس مسئلہ پر دونوں ممالک کے سربراہوں کے درمیان بات چیت سے بڑھ کر کوئی تصفیہ بھی ہوا؟ اگر محض بات چیت ہو جانا ہی اطمینان کا باعث ہے تو پھر پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ کام تو ۱۸ برس کے دوران میں وقتاً فوقتاً ہوتا ہی رہا ہے۔

آج ہمیں بتایا جاتا ہے کہ پاکستان کو امریکہ یا روس میں سے کسی ایک نے اس امر کی یقین دہانی کرائی ہے کہ وہ اُسے اب اس کا جائز حق دلانے میں پُوری مدد کرے گا۔ درپردہ کوئی بات اگر واقعی ہوئی بھی ہو تو وہ پردے ہی میں رہ گئی۔ جو کچھ دنیا کے سامنے آیا ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ امریکہ کے صدر نے کشمیر کے معاملہ میں کوئی اخلاقی ذمّہ داری بھی اپنے سر نہیں لی، اور روس کے وزیراعظم نے تاشقند کے اقرارنامے پر بطور گواہ دستخط ثبت کیے ہیں، اس سے زیادہ اُس نے کسی چیز کی ضمانت نہیں دی۔ اب یہ باور کرنے کے لیے خوش فہمی کی بہت بڑی مقدار درکار ہے کہ چند افراد کے درمیان ایک بند کمرے میں بیٹھ کر جو گفت وشنید ہوئی، وہ ہمارے لیے کوئی وثیقہ ہو سکتی ہے جو کسی وقت ہمارے کام آسکے۔ جہاں لکھے ہوئے معاہدے دھرے رہ جاتے ہیں اور دنیا بھر کے سامنے علی الاعلان مشتہر کیے ہوئے قول وقرار تک سے انحراف کر ڈالا جاتا ہے، وہاں درپردہ یقین دہانیوں سے آخر کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ وہ افراد جن کے درمیان خفیہ گفتگو میں کوئی یقین دہانی کرائی گئی ہو، اگر مر جائیں،

جس طرح شاستری جی مر گئے، تو وہ یقین دہانی ان کے ساتھ ہی دفن ہو جائے گی، باقی صرف وہ تحریرہ جائے گی جو تاشقند میں لکھی گئی ہے، اور اس پر وزیر اعظم روس کی گواہی کے سوا کسی یقین دہانی کا ادنیٰ سا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔

تیسری چیز جو ذہن میں بار بار کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر اعلانِ تاشقند میں وہی کچھ لکھا جانا تھا جو اس میں لکھا گیا ہے تو اس کے لیے اتنی سر دردی کی ضرورت ہی کیا تھی کہ پہلے امریکہ میں بات چیت ہوتی اور پھر روس میں کئی دنوں تک کھینچا تانی ہوتی رہی۔ اگر اس ساری جدوجہد اور تگ و دو کا ماحصل یہ چند مقدس خیالات ہی تھے تو یہ کام تو جنگ سے پہلے خود اسی سرزمین پر بطریقِ احسن کیا جا سکتا تھا۔ کیا ہندوستان اس سے پہلے بارہا یہ نہ کہہ چکا تھا کہ دونوں ملکوں کے جھگڑے طے ہوں یا نہ ہوں، مگر ہمیں باہم یہ اقرار کر لینا چاہیے کہ ہم کسی جھگڑے کو طے کرنے کے لیے طاقت استعمال نہیں کریں گے؟ کیا اس نے بارہا اس خواہش کا اظہار نہیں کیا کہ دونوں ممالک کو اچھے ہمسایوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہنا چاہیے اور امن کی فضا قائم رکھنے میں ایک دوسرے سے تعاون کرنا چاہیے؟ ابھی چند سالوں کی بات ہے کہ بھارت کے وزیر خارجہ سردار سورن سنگھ نے امن کی برکات پر پاکستان میں کھڑے ہو کر ایک نہایت ہی عمدہ تقریر کی تھی۔ خود پنڈت جواہر لال نہرو نے لاہور میں بڑے جذباتی انداز میں دونوں ممالک کے درمیان خوشگوار تعلقات کی اہمیت پر زور دیا تھا۔ بھارت اس قسم کی دلفریب باتیں پہلے بھی کرتا رہا ہے، اور امریکہ اور روس نے بھی پہلے کبھی ہمیں جنگ و جدال پر برانگیختہ نہیں کیا تھا کہ اب ان کی طرف سے یہ بات کوئی نئی بات ہو کہ وہ ہمیں امن سے رہنے اور نزاعات کے حل کے لیے طاقت کے استعمال سے پرہیز کرنے کی نصیحت کریں۔ سوال یہ ہے کہ اگر ہمیں کشمیر کے باشندوں کو حقِ خود اختیاری دلوائے بغیر ہندوستان کے ساتھ ہی عدمِ محاربہ کا اقرار کر لینا تھا تو اس قدر خون خرابہ کرانے کی کیا ضرورت تھی اور امریکہ و روس کے چکر کاٹنے کا کیا فائدہ تھا۔ کشمیر کے مستقبل سے ہاتھ دھو کر ایسے اقرار نامہ پر تو ہم جنگ کے بغیر اور کسی روس یا امریکہ کے توسط کے بغیر دہلی یا

راولپنڈی میں ہی بآسانی دستخط کرسکتے تھے۔ اس کارِ خیر میں آخر اتنی تاخیر کیوں کی گئی اور بعد از خرابیٔ بسیار ہی یہ کام کیوں کیا گیا؟

اسی ضمن میں یہ چیز بھی بار بار ذہن میں آتی ہے کہ اگر ہم محض امن و آشتی کے لیے اور دوستی کی تجدید کے لیے تاشقند گئے تھے تو وہاں اتنے دن جو بحث و تمحیص ہوتی رہی اس کی کیا ضرورت تھی۔ پاکستان کے اخبارات میں اس کانفرنس کی جو رُوداد چھپتی رہی ہے ظاہر ہے کہ اُسے سرکاری طور پر ہی مرتب کرکے بھیجا جاتا رہا ہوگا۔ اُس کے مطالعہ سے نو۔ ۱۰ جنوری کی صبح تک کے اخبارات سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ دونوں ممالک کشمیر کے بارے میں اپنے اپنے موقف پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ بھارت اِس پر مُصر ہے کہ کشمیر اس کا اٹوٹ انگ ہے، اور وہ چاہتا ہے کہ کشمیر کا مسئلہ طے کیے بغیر پاکستان اس سے عدمِ جنگ کا معاہدہ کرلے۔ اس کے مقابلے میں پاکستان شدت کے ساتھ اپنے اس موقف پر قائم ہے کہ کشمیر ہی دونوں ملکوں کے درمیان جنگ کا اصل سبب ہے اور جب تک اس مسئلے کو منصفانہ طریقے سے حل کرنے کی کوئی ضمانت نہ ملے ہندوستان کے ساتھ عدمِ جنگ کا معاہدہ ہرگز نہیں کیا جاسکتا۔ ان خبروں سے ہر شخص یہی توقع کر رہا تھا کہ یہ کانفرنس ناکام ہوگی۔ تعطّل اور مایوسی کی یہ فضا آخری وقت تک قائم رہی اور اعلانِ تاشقند کی خبر آنے سے چند گھنٹے پہلے تک یہاں اخبارات میں یہ سرخیاں چھپتی رہیں: "تاشقند کانفرنس ناکام ہوگئی، کوئی مشترکہ اعلان جاری نہیں کیا جائے گا"۔ ۱۰ جنوری کی صبح تک فضا میں عام تاثر یہی تھا کہ بھارت کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے پاکستانی وفد کوئی فیصلہ کیے بغیر واپس آجائیگا۔ مگر شام سے پہلے ریڈیو سے جو خبریں نشر ہوئیں ان میں کانفرنس کی کامیابی کا مژدہ سنایا گیا۔ اس ملک کے عوام اس حقیقت کو جاننے کے آرزومند ہیں کہ بھارت نے کس معاملے میں اپنی ہٹ دھرمی کی روش چھوڑ کر پاکستان کی کسی جائز بات کو تسلیم کیا؟ کیا وہ کشمیر کو اپنا اٹوٹ انگ اور داخلی معاملہ کہنے سے باز آگیا؟ کیا اس نے یہ مان لیا کہ کشمیر ایک متنازع فیہ علاقہ ہے؟ کیا وہ اس بات پر راضی ہوگیا کہ آئندہ وہ کشمیر کے مسئلے کو پُرامن اور منصفانہ طریقے سے طے کرنے کے لیے بات کرے گا؟ اگر ان میں سے کسی ایک

بات کو بھی اس نے نہیں مانا تو آخر وہ چیز کیا ہے جس کی وجہ سے پاکستان دفعتاً اپنا رویہ بدلنے پر مجبور ہوا اور کانفرنس ناکام ہوتے ہوتے اچانک کامیاب ہو گئی؟ اگر اصحابِ اقتدار میں سے کوئی ذمہ دار بزرگ اس حقیقت کی نقاب کشائی کر دیں تو عوام کا اضطراب بھی بڑی آسانی کے ساتھ اطمینان میں بدل سکتا ہے۔

ایک اور الجھن جو عوام کو پریشان کر رہی ہے وہ دونوں افواج کی واپسی کا مسئلہ ہے۔ ہم پوری دنیا کے سامنے بڑے زوردار انداز میں یہ کہتے رہے ہیں کہ بھارت نے چھ ستمبر کو بین الاقوامی سرحد کو عبور کر کے پاکستان پر بالکل بے خبری کے عالم میں حملہ کر دیا اور اس طرح ایسی جارحیت کا مظاہرہ کیا جس کی کسی شریف اور اچھے ہمسائے سے توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس کے مقابلے میں بھارت کا موقف یہ رہا ہے کہ اس جنگ کا آغاز پاکستان نے ۵ اگست کو ہمارے ملک کے ایک حصے (یعنی کشمیر) میں مسلح افراد داخل کر کے کیا تھا، اور اس حملے کو ناکام بنانے کے لیے ہمیں ۶ ستمبر کو لاہور اور سیالکوٹ پر مجبوراً فوج کشی کرنی پڑی۔ ہمارا ریڈیو، ہمارا پریس، ہماری حکومت کے ذمہ دار افراد سب بھارت کو جارحیت کا مرتکب قرار دیتے رہے۔ اقوامِ متحدہ کے سامنے بھی ہم نے یہی موقف اختیار کیا۔ اگر ہمارا یہ موقف درست ہے اور بلا شبہ درست ہے تو پھر فوجوں کی واپسی کے معاملے میں ۵ اگست کی تاریخ کو نقطۂ آغاز ماننے کے کیا معنی ہیں۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم نے سادگی میں بھارت کے اس جھوٹے دعوے کو تسلیم کر لیا کہ جارحیت کا ارتکاب ۶ ستمبر کو نہیں بلکہ ۵ اگست کو ہوا تھا، اور ۵ اگست کی تاریخ وہ ہے جس میں بھارت کا الزام یہ ہے کہ ہم نے مسلح حملہ آور اس کے علاقے میں داخل کیے تھے۔ کیا اس طرح ہم نے خود اپنے اوپر جارحیت کا الزام چسپاں نہیں کرا لیا؟ اس پر مزید عقلمندی ہم نے یہ کی ہے کہ اعلان تاشقند میں فوجوں کی واپسی کی قرارداد کے اندر "مسلح افواج" کے بجائے "مسلح افراد" کی اصطلاح استعمال کرنا قبول کر لیا تاکہ الزام کے چسپاں ہونے میں اگر کچھ کسر رہ گئی ہو تو وہ پوری ہو جائے۔

اب اگر صورت حال فی الواقع یہی ہے جس کا مسلح افراد کو ۵ اگست کی پوزیشن پر واپس لانے کی

(باقی صا۷ پر)